تہذیبوں کی حیات و موت کا مسئلہ
اور
مسلم سوسائٹی

گزشتہ صدی میں جب تقریباً پوری مسلم دنیا مغرب کی فوجی طاقت کا نشانہ بنی اور اس نئی طاقت کو چیلنج کرنے والا کوئی مسلمان ملک باقی نہ رہا' (۱) تو مسلم دنیا کے ارباب فکر نے عہد حاضر کے اس تاریخی المیہ پر صف ماتم بچھائی اور امت کے سیاسی زوال کے اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ہر چند مسلم تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کی داستان لکھنے کے لیے مسلم دنیا کو کوئی گبن نہ مل سکا جو "سلطنت روما کے زوال" (The Decline And Fall of Roman Empire) کی طرز پر

۱۔ صرف ترکی ایک اسلامی ملک تھا' جس پر مغربی طاقتیں قبضہ نہ کر سکیں' لیکن جنگ عظیم کے خاتمے پر جب استنبول پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی' اور شکست خوردہ عثمانی خلافت نے ۱۹۱۹ء میں ایک ذلت آمیز معاہدے پر دستخط کیے' تو مصطفیٰ کمال پاشا جیسا عبقری سپاہی میدان میں آگیا اور مغربی طاقتوں اور ان کے نمائندے یونان کو شکست دے کر ترکی کو آزاد رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اقبال نے جدید ترکی اور اس کی آزاد فکر کی کھل کر تعریف کی ہے' اسی طرح ابوالکلام نے جدید ترکی میں کیے گئے بعض انتہا پسند فیصلوں کی ذمہ داری ہمارے قدیم "عقیم نظام تعلیم" پر ڈالی ہے۔

مسلم سلطنت کے زوال کی داستان لکھتا' لیکن یہ کہنا صحیح ہو گا کہ مسلم دانش مندوں کی راتیں بھی امت کے اسباب زوال کی تلاش میں برابر پیچ و تاب میں گزریں' وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری ناکامی کا بنیادی سبب حکمرانوں کا استبداد اور علماء کا جمود ہے' یہ انکشاف (استبداد اور جمود) کوئی نیا انکشاف نہیں تھا' اس سے پہلے تقریباً یہی بات ابن قیم اور شاہ ولی اللہ اپنی تحریروں میں لکھ چکے تھے۔ لیکن مسلم فکر جمود یا استبداد کا شکار کیوں ہوئی؟ یا حریت فکر اور اظہار رائے کی آزادی پر پابندی کیوں لگائی گئی؟ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے صحیح تعلیم و تربیت کے حصول پر زیادہ زور دیا گیا اور کہا گیا کہ ہماری سیاسی' اجتماعی اور اخلاقی پس ماندگی کا علاج تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔

جمال الدین افغانی' عبدالرحمان الکواکبی اور شیخ محمد عبدہ کی تحریروں نے (خاص طور پر موخر الذکر کے افکار) مسلمانوں سے برابر اپیل کی کہ وہ اپنے زوال پذیر فکری اور اجتماعی نظام کو بدلیں جو ان کے صحت مند مذہبی اور ثقافتی روایات کی ترجمانی نہیں کرتا۔ شیخ محمد عبدہ اور شیخ رشید رضا نے اصلاحی پروگرام بھی پیش کیا جو عربی زبان کے پر تکلف اسلوب بیان' جامعہ ازہر کے پرانے نصاب تعلیم اور شرعی عدالتوں کے منجمد اور بے روح نظام کے خاتمے کا تقاضا کرتا تھا۔ چنانچہ عبدہ نے نہ صرف ازہری نصاب تعلیم کا تنقیدی جائزہ لیا' بلکہ قرآن مجید کے پیغام کو عام کرنے کے لیے قرآن مجید کا برابر درس بھی دیا' جس میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام نام ہے عقیدہ و عمل کا' ذوق عمل سے محرومی دراصل دین سے محرومی ہے' کسی دین کی طرف صرف زبانی انتساب انسان کے لیے قطعاً" سودمند نہیں ہے۔ حضرت شیخ نے قرآن مجید کے آخری پارے کی تفسیر میں دین کو اس کی ابتدائی صورت میں پیش کیا ہے اور فلسفہ دین کی تشریح علم کلام کی بجائے کتاب و سنت کی روشنی میں کی ہے۔ رشید رضا کی تفسیر "المنار" دراصل محمد عبدہ کے مذہبی افکار کا عکس ہے۔ شیخ کی اصلاحی

تحریک پر علمائے ازہر نے سخت تنقید کی اور انہیں ازہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا' چنانچہ وہ یہ کہتے ہوئے جامعہ ازہر سے رخصت ہوئے کہ میں جامعہ ازہر میں آگ کی جس چنگاری کو چھوڑے جا رہا ہوں' وہ آئندہ تیس سال کے بعد ازہر کے پورے نظام کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ علمائے ازہر کے جمود کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۰۵ء تک ازہر میں دنیائے اسلام کے معروف فلسفی مورخ ابن خلدون کی کتاب "المقدمہ" کا پڑھانا منع تھا۔ پوری مسلم دنیا خاص طور پر مصر کی فکری اور مذہبی زندگی کی کہانی رشید رضا کی معروف کتاب' تاریخ الاستاذ الامام اور مرحوم احمد امین کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس صورت حال کا سامنا برصغیر کے مسلمانوں کو بھی کرنا پڑا۔ یہاں ۱۷۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی سیادت آہستہ آہستہ بیرونی اور داخلی باغی طاقتوں کے سامنے ہتھیار ڈالتی چلی گئی' حتی کہ ۱۸۰۱ء میں انگریز نے بقول تھامسن (Thomson) دہلی کو مسلمانوں سے نہیں بلکہ مرہٹوں سے چھینا تھا اور مغل بادشاہ کو نمائش کے لیے سامنے رکھا' تاکہ مسلمانوں کی شکستہ انا اور ان کے جھوٹے پندار کی تسکین ہوتی رہے' انہیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ مسلم اور ہندوستانی معاشرہ کس تیزی سے اخلاقی اور سیاسی پستی کی طرف بڑھ رہا ہے اور پس پردہ حکمران کون ہے؟ ان کی تسکین کے لیے یہی کافی تھا کہ مغل بادشاہ کا نعرہ ہوا میں گونجتا رہے۔ ۱۸۵۷ء میں اجنبی اقتدار نے اس تکلف کو بھی روا نہ رکھا۔

جب مسلم تہذیب و تمدن پر نزع کا عالم طاری تھا' اور غالب دلی میں چپکے چپکے ماتم کر رہے تھے' اہل درد نے اپنے مستقبل کے لیے سوچ بچار کی' ایک جماعت کی رائے تھی کہ ماضی میں پناہ لے کر ہم اپنے تاریخی "ورثے" کو بچا سکتے ہیں۔ دوسرے گروہ کی رائے تھی کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے روح عصر سے مزید تغافل برتنا "جرم" ہے اور "ماضی اسیر ماحول" کو نہ تو واپس لایا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ بات ہمارے مسائل کا حل ہے۔ پہلے گروہ نے قدامت پسندی

کی راہ پر چلتے ہوئے ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور دوسرے گروہ نے روح عصر سے آشنائی کا دعویٰ کرتے ہوئے علی گڑھ ادارے کو قائم کیا۔ دونوں مسلمانوں کا درد رکھتے تھے اور ان کی کشتی حیات کو زوال و انحطاط کے بھنور سے نکالنے کے لیے بے تاب۔ ایک ماضی کی طرف دیکھ رہا تھا تو دوسرا مستقبل کی طرف۔ دونوں اداروں نے اپنے طرز فکر کی روشنی میں ایک نئے روحانی، اخلاقی اور عصری انسان کی تخلیق کا خواب دیکھا، چوں کہ دونوں کا طرز فکر ایک دوسرے سے مختلف تھا، اس لیے ان میں نہ تو باہمی تعاون کی کوئی صورت پیدا ہوئی، اور نہ ہی کسی معروضی اور فلسفیانہ سوچ کو آگے بڑھایا گیا۔ چنانچہ دونوں اپنے نصاب تعلیم کو اپنے اپنے دائرے میں ٹھوس بنیادوں پر استوار نہ کرسکے۔ دونوں اداروں کو قریب لانے اور قدیم و جدید کی تقسیم کو ختم کرنے کے لیے مولانا محمود حسن دیوبندی نے جو اپنے زہد و تقویٰ اور تحریک آزادی میں بے لوث سعی و عمل کے لیے معروف تھے، ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ ارباب جامعہ کی یہ رائے صحیح تھی کہ ٹھوس فکری بنیادوں پر وہی آدمی یا گروہ تعلیمی نظام مرتب کرسکتا ہے، جو معاشرے میں کام کرنے والے عوامل، تاریخ کے رخ کو بدلنے والے اسباب اور جدید مغربی فکر سے آگہی رکھتا ہو۔ جامعہ ملیہ دہلی سے قبل ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء، لکھنؤ وجود میں آیا، جس کا بنیادی مقصد تعلیم سے متعلق قدیم اور جدید نقطہ ہائے نظر میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ لیکن عمومی طور پر اس کا مزاج قدامت پسند ہی رہا، چنانچہ ارباب ندوہ نے اپنی تعلیمی پالیسی میں طالب علموں کے لیے عرب تمدن و معاشرت کو اختیار کرنا ضروری جانا۔ ندوۃ کا یہ موقف دراصل "علی گڑھ فکر" کا ردعمل تھا۔ جس میں انگریز معاشرت اور تمدن کو اپنانا نئی تعلیمی پالیسی کا مقصد قرار دیا گیا تھا۔ ان تعلیمی اداروں کے قیام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم اہل علم کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ مسلم

جماعت کی شکستگی کا واحد علاج مسلمانوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں مضمر ہے اور ان کی نشاۃ ثانیہ' فکری و اخلاقی انقلاب لائے بغیر ممکن نہیں اور یہ انقلاب تعلیم و تربیت کی راہ ہی سے لایا جاسکتا ہے۔

اس صدی کی دوسری دہائی میں برصغیر کے سٹیج پر مسلمانوں کی دو ممتاز شخصیتیں : اقبال اور ابوالکلام آزاد نمودار ہوئیں' جو نہ صرف اپنے فکری ورثے سے آگاہ تھیں' بلکہ عہد حاضر میں ان سیاسی اور فکری تحریکوں کا بھی علم رکھتی تھیں جنہوں نے آج پوری دنیا پر اپنی سیادت کا جھنڈا بلند کر رکھا ہے۔ اقبال مغربی فکر و فلسفہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان سے پہلے جن لوگوں نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جدید افکار کو پڑھنے کا مشورہ دیا مثلاً سرسید مرحوم' ان کے ساتھی یا شیخ محمد عبدہ حتیٰ کہ جمال الدین افغانی۔ وہ مغربی فکر کے بنیادی ماخذوں سے واقف نہیں تھے۔ اقبال اپنے قیام مغرب میں مغرب کے سیاسی فلسفے' اس کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خاندانی ماحول' ابتدائی اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور غیر معمولی فکری صلاحیتوں کی وجہ سے اسلامی فکر پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے سرسید کی تحریک جدیدیت کو فکری بنیاد فراہم کر کے اسے آگے بڑھایا اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے ملی ورثے اور مغربی فلسفے پر تنقید کی اور بتایا کہ مغرب انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے خطرہ ہے اور آزاد فضا ہی میں انسانی فکر و عمل کے جوہر کھلتے ہیں' غلاموں کی بصیرت حتی کہ بندگی بھی قابل اعتماد نہیں۔ ابوالکلام آزاد اپنی خاندانی روایات' پرانے نظام تعلیم (درس نظامی) کی تکمیل اور ذاتی ذہانت و فراست کی وجہ سے اسلام کے کلاسیکل ورثے پر عبور و رسوخ رکھتے تھے۔ ذوق تجسس نے ان پر فکر و نظر کی نئی نئی راہیں کھولیں اور ادراک حقیقت کے لیے انہوں نے اپنے اوپر نئی راہوں کو بند نہیں کیا' جیساکہ علما وقت کی اکثریت نے ایک مدت سے کر رکھا ہے۔ غرضیکہ یہ دونوں مفکر علم و فلسفہ کی

دنیا میں قدیم اور جدید کا عمدہ امتزاج تھے۔ چنانچہ دونوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑے بغیر جدید مسائل کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھیں اور وقت کے پہلو بہ پہلو چلنے سے گریز نہ کریں' نیز یہ کہ زندگی تغیرپذیر واقع ہوئی ہے' اس لیے روح عصر کا ساتھ دیں۔ عہد حاضر میں اقبال شاید پہلے مسلم مفکر ہیں جنھوں نے اپنی الہامی شاعری اور فکر انگیز تحریروں سے زندگی کے بارے میں ایک بھولی ہوئی سچائی یعنی اسلام کے "حرکی" تصور کو واضح کیا اور بتایا کہ انسانی فکر کا قدم علم و فلسفہ کے کسی ایک مقام پر رکتا نہیں ہے۔ اسلام کے دور اول میں مسلم مفکرین نے جو قیمتی ورثہ چھوڑا ہے' وہ انسانی علم کی انتہا نہیں ہے' کیوں کہ زندگی کے بارے میں اسلام کے اس حرکی تصور نے انسانی علم کے سامنے ترقی کے لامحدود دروازے کھول دیئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جہاں یہ فرمایا کہ ادھر پانچ سو سال سے مسلمانوں کی فکری زندگی پر جمود طاری ہے' وہاں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایشیا اور دنیائے قدیم کے تمدن اس لیے ناکام ہوئے کہ انہوں نے ادراک حقیقت کے لیے باطن کی راہ اختیار کی اور پھر ظاہر کی طرف آئے۔ یہ طریق کار کسی نظریے کو جنم تو دے سکتا ہے' لیکن محض نظریے کی بنیاد پر کسی دیرپا تہذیب کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ ظاہر و باطن یا آفاق و انفس یا دین و دنیا کے درمیان اعتدال و توازن اور تخلیقی فکر ہی ایک صحت مند اور پائیدار تہذیب کو جنم دے سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں مسلمانوں کا فکری جمود' روح تجسس کا فقدان اور ذوق عمل سے محرومی' ان کی فکری و سیاسی سیادت کے زوال کا موجب بنے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسرار خودی کے مقدمے میں فارسی کے ایک ممتاز شاعر اور تصوف کے بعض فلسفیانہ افکار پر کڑی تنقید کی۔ کیوں کہ وہ ان کی رائے میں ایک پرشکوہ اور باوقار زندگی کی جنگ جیتنے کے لیے مسلمانوں کو سعی و عمل اور جدوجہد سے دور لیے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نزدیک شعر و ادب اور فلسفہ و

مذہب کو جانچنے کا پیمانہ آدمی کی شخصیت ہے۔

عہد حاضر کا یہ واقعہ بھی دیدنی ہے کہ اقبال جیسے مفکر نے تصوف پر سخت تنقید کی' لیکن خدا کے بارے میں ابھرنے والے سوالات کا جواب انہیں تصوف ہی میں ملا۔ یعنی مذہبی تجربے میں اور جب انہوں نے اپنے انگریزی لیکچرز تیار کئے' تو انہیں ایک عارف اور صوفی کی مسند پر بیٹھ کر ہی اہل علم کے سامنے پیش کیا۔ یہی موقف ابوالکلام نے ترجمان القرآن میں جو ان کے پختہ فکر کا شاہکار ہے۔ اختیار کیا۔ چنانچہ انہوں نے اسرار دین کو واکرنے کے لیے قرآن ہی سے روشنی حاصل کی اور روحانی تجربے پر اعتماد کیا' جو ہر دین کی اصل روح ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال اور آزاد کی مجتہدانہ فکر نے مذہبی روح سے سرشار ہو کر اسلام کی بنیادی تعلیم: خدا سرشاری اور انسان دوستی کو جو جمود' تنگ نظری اور فرقہ واریت کے گرد و غبار میں اٹ کر عام نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی' اجاگر کیا۔ قرآن مجید نے قوموں کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ افراد کی طرح ہر قوم یا تہذیب کے لیے بھی موت کا ایک دن معین ہے۔ جب وہ گھڑی آن پہنچتی ہے' تو کوئی اسے ٹال نہیں سکتا' لیکن اس بربادی کی ذمہ داری خدا کے کندھوں پر نہیں' بلکہ خود اس تہذیب پر عائد ہوتی ہے' جس نے خدا کے بنائے ہوئے قانون حیات کو توڑا۔ چنانچہ قرآن نے سورہ الاسراء میں فرمایا کہ جب ہم کسی قوم یا تہذیب کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پسند اور تن آساں ٹولے کو (مترفین)' جو اپنی دولت کے بل پر برسراقتدار آیا ہے' اپنے قوانین کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں' لیکن وہ ایسے کرنے پر ناکام رہتا ہے اور پاداش عمل میں ہم اسے تہس نہس کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید نے سورہ الاعراف میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کو اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں' جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں اور ان پھندوں کو

کاٹ دیتے ہیں، جن میں وہ گرفتار ہیں۔ لیکن یہ "بوجھ" اور "پھندے" (اصر' اغلال) کیا ہیں؟ ان کی تشریح کرتے ہوئے آزاد کہتے ہیں: "مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں۔ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی... افسوس! جن پھندوں سے قرآن نے اہل کتاب کو نجات دلائی تھی، مسلمانوں نے وہی پھندے پھر اپنے گلے میں ڈال لئے۔" (ترجمان القرآن ج ۲)

قرآن مجید نے قوموں کے عروج و زوال کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ افراد اور قوموں کے لیے قانون حیات ایک ہے اور اٹل۔ وہ کسی کی خاطر اپنے فیصلے کو نہیں بدلتا۔ چنانچہ وہ زندگی کے سٹیج پر ہر قوم کو اپنا کردار ادا کرنے کا حق دیتا ہے اور جب کوئی قوم اپنی نالائقی سے یہ کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتی، تو اسے سٹیج سے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ عمر خیام نے بہ قول ابوالکلام اسی قانون حیات کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: "زندگی کی کہانی ایک ہے، جو ہمیشہ نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں دہرائی جا رہی ہے۔" ابن خلدون اس کہانی کے بارے میں لکھتے ہیں: "اگر ہم زمانوں اور ناموں کی قید نکال دیں، تو ایک قوم اور ایک زمانہ کی تاریخ بجنسہ ہر قوم اور زمانے کے لیے کام دے سکتی ہے، کیوں کہ ناموں اور صورتوں کے تغیر کے سوا اقوام کے حالات میں اور کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ (ا) قرآن مجید کے بیان کردہ اسی قانون حیات کے بارے میں ایک معروف برطانوی دانش مند آربری نے کہا ہے کہ "تعلیمات قرآن کا شکریہ! کہ ان کی بدولت تاریخ میں عرب پہلی قوم ہے، جو تہذیبوں کی حیات و ممات کے راز سے پوری طرح آگاہ ہوئی۔"

ا۔ خطبات آزاد، دہلی ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۲۔ ۷۴ (مرتبہ مالک رام)

القصہ اقبال اور آزاد کی سنجیدہ تحریروں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہوئے واضح کیا کہ مسلمانوں کی علمی اور فکری زندگی پر صدیوں سے جو افسردگی طاری ہے' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بہ وجوہ فکری آزادی' ذوق تجسس اور جذبہ عمل سے محروم ہوگئے ہیں۔ تقلید' جمود اور اسلاف پرستی نے انہیں علم و فلسفہ اور مشاہدہ و تجربہ کے میدان میں کام کرنے سے روک دیا ہے اور اسی تقلید کی وجہ سے انہوں نے قدماء کے افکار کو حرف آخر سمجھ کر زندگی کے حرکی تصور سے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ آج زندگی کے جن عظیم مسائل پر اہل مغرب سنجیدگی سے سوچ بچار کر رہے ہیں' ان مسائل پر سوچ بچار کرنا کبھی مسلم دانش مندوں کا امتیازی نشان تھا' لیکن آج کے مسلم اہل علم کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں' کیوں کہ وہ اپنے مسائل کا حل ماضی میں تلاش کر رہے ہیں اور زندگی کے "حرکی تصور" کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ چنانچہ فکری آزادی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کئے بغیر ہم ادب' فلسفہ' سیاست' قانون' معیشت کے کسی میدان میں کوئی تخلیقی کام نہیں کرسکتے۔ ہمارا نظام تعلیم و تربیت ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار اور منظم کرنے میں ناکام رہا ہے۔

اقبال نے مسلمانوں کے فکری اور سیاسی کارناموں پر جو ٹھوس تنقید کی ہے' اس کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ابن خلدون کے بعد وہ شاید پہلے مسلم مفکر ہیں' جنھوں نے انسانی تہذیب میں مسلمانوں کی خدمات کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھا ہے' مثلاً انہوں نے مسلمانوں کی فتوحات کو ان کی تخلیقی فکر کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہوئے کہا کہ "وہ (مسلمان) کپل (Kapil) یا شنکر اچاریہ جیسی شخصیتیں پیدا نہ کرسکے۔" یا "ایشیائی سیاست کی نشوونما میں کوئی کردار ادا نہ کرسکے۔" اس تنقید سے ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلم دنیا ازسرنو ٹھوس فکری بنیادوں پر اپنا اجتماعی نظام استوار کرے اور خود فریبی اور ماضی کی قید سے باہر نکل کر داخلی اور خارجی حریف طاقتوں کا مقابلہ کرکے تاریخ

میں اپنا رول ادا کرے حتیٰ کہ انہوں نے ۸ دسمبر ۱۹۳۶ء کو قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا کہ "وہ دسمبر یا جنوری ۱۹۳۷ء کے شروع میں پنجاب آئیں اور انتخابات سے پہلے وہ، شوکت علی اور (مفتی) کفایت اللہ لوگوں کو خطاب کریں، تاکہ رجعت پسند طاقتوں کو توڑنے کی آخری کوشش کی جاسکے۔"

(" So that a last effort may be made to break the forces of reaction")

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال اور جناح دونوں نے رجعت پسند طاقتوں کے خلاف لکھا ہے، جو جمود، استبداد اور استحصال کی علامتیں ہیں، اور تخلیقی فکر کی حریف۔

چونکہ اقبال کے پیش نظر ملت کا مجموعی مفاد اور انسانی وقار کے تحفظ کا مسئلہ ہے، اس لیے انہوں نے اپنی تحریروں میں، خاص طور پر اپنے چھٹے انگریزی لیکچر میں مسلم سوسائٹی کے طرز فکر اور طرز عمل پر کھل کر تنقید کی اور بتایا کہ قانون کی مستند کتابوں پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ برصغیر میں ملی مفاد کا تحفظ ممکن نہیں، کیوں کہ قانون جامد ہے اور زندگی برابر حرکت میں ہے۔

اس لیکچر میں انہوں نے مزید کہا کہ اکثر مسلمان ملک مشینی انداز سے پرانی قدروں کو دہرا رہے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں تخلیقی فکر و احساس کا فقدان ہے، ظاہر ہے کہ یہ امر ایک تہذیب کی موت ہوتا ہے یا یہ کہ ماضی سے مسلمانوں کی جھوٹی عقیدت ان کے قومی زوال کا علاج نہیں ہے۔ ایک قوم اپنے زوال کو کیوں کر روک سکتی ہے؟ یہاں اقبال نے اپنے ایک ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتے ہوئے کہا: "تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایسی قوم میں فرسودہ افکار جی دار ہو کر نہیں ابھرتے، جس نے انہیں فرسودہ کر دیا ہے۔" اقبال مزید فرماتے ہیں: "چنانچہ وہ تنہا قوت جو کسی قوم کے اندر اسباب زوال

کے لیے موثر ہو سکتی ہے۔ وہ ہے اپنی ذات میں انجمن بننے والی شخصیتوں کا پروان چڑھنا۔ ایسے ہی افراد بحر وجود کی تہوں کو کھنگالتے ہیں وہ تنہا ایسے ایسے اصول کا سراغ لگاتے ہیں' جن کی روشنی میں ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ ہمارا معاشرے سراسر قابل احترام نہیں ہے' اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔"

فکری آزادی کی حمایت' جمود اور استبداد کی مذمت میں اقبال اور آزاد نے اپنی زوردار تحریروں میں تقریباً یکساں موقف اختیار کیا اور دونوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلم سوسائٹی میں زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ راست بازی' فکر کی آزادی' نگاہ کی بلندی اور کریکٹر کی پاکیزگی ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کا رشتہ خدا اور کائنات سے ٹوٹا اور قرآن کا پیغام ان کی نگاہ سے اوجھل ہوا' تو اب سچائی' عمل' محنت' جدوجہد' عقل' تجربہ اور تاریخ کی جگہ ہم نے چند رسومات کا سہارا لیا' آفت پر آفت یہ آئی کہ ہم نے ان رسوم اور زبانی دعووں کو جنہیں قرآن کی بولی میں نفاق کہا جاتا ہے' قرآن مجید کی تعلیم قرار دیا۔

یہ بات محتاج بیان نہیں' کہ نفاق' بدعملی اور تن آسانی کے نتیجے میں وقت نے مسلمانوں کو جیسا کہ ہیگل نے کہا ہے "تاریخ کے سٹیج سے پیچھے دھکیل دیا۔"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں (اقبال اور آزاد) مسلمانوں کی قدیم اور جدید تعلیم اور ان کے نام لیواؤں سے خوش نہیں تھے۔ اگر اقبال جدید تعلیم یافتہ گروہ سے مایوس تھے' تو آزاد بھی علماء سے ناامید تھے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ دونوں مسلم تہذیب و تمدن کے عروج و زوال اور مغربی سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کے زوال پر کوئی مستقل کتاب نہ لکھ سکے' جو "زوال سلطنت روما" کی طرح مسلم قوم کے ہاتھ میں ایک تاریخی دستاویز ہوتی۔ گبن نے یہ کتاب لکھ کر دراصل مغرب کی ہزار

سالہ تہذیب کی داستان لکھی اور مغربی طاقتوں کو تاریخ کے فیصلوں سے آگاہ کیا' تاکہ وہ اپنی نشاۃ ثانیہ میں (یہ کتاب اٹھارویں صدی میں لکھی گئی) اس راہ پر نہ چلیں' جس پر چل کر سلطنت روما تباہ ہوگئی تھی۔

صحیح بات یہ ہے کہ "سلطنت روما" نے اپنا دوسرا جنم جدید مغرب کی صورت میں لیا ہے۔ اس لیے گبن نے جدید یورپ کو متنبہ کیا کہ وہ سلطنت روما کے انجام سے بے خبر نہ رہے' اس بات کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گبن نے سلطنت روما کی تباہی میں مذہب (عیسائیت) کو ایک بڑا سبب قرار دیا۔

ہرچند بعض حلقوں میں مذہب پر گبن کی تنقید کو پسند نہیں کیا گیا یا اس کتاب کو فن تاریخ نویسی کی بجائے خطابت کا شاہکار قرار دیا گیا' لیکن مجموعی طور پر اس کتاب نے یورپ کے علمی حلقوں میں بڑا مقام پایا اور اہل علم اور اہل سیاست نے اس کا خیر مقدم کیا اور ان کی فکری صلاحیتوں کو جھنجھوڑنے میں اس کتاب نے ایک تاریخی کردار ادا کیا' جس کا اعتراف آج تک کیا جا رہا ہے۔

گبن کے بعد مغربی تہذیب کے زوال پر بیسویں صدی کے آغاز میں جرمن مفکر سپنگلر (Spengler) نے "زوال یورپ" (The Decline of The West) کے نام سے اپنی شہرہ آفاق کتاب لکھی اور تہذیبوں کے عروج و زوال سے متعلق ابن خلدون کے نقطہ نظر کو معروضی انداز میں تفصیل سے پیش کیا اور کہا کہ فطرت کی دوسری موجودات کی طرح تہذیبیں بھی ایک مشترکہ قانون حیات۔ پیدائش' نشوونما' زوال اور موت۔ کی پیروی کرتی ہیں۔ چنانچہ اس طریق سے نہ صرف ماضی کی مختلف تہذیبوں کے درمیان مقارنہ و موازنہ کیا جاسکتا ہے' بلکہ ہماری اپنی تہذیب کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی بھی کی جاسکتی ہے۔ سپنگلر نے گوئٹے کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کلچر' کی نشوونما کے چار مراحل قرار دیئے جس کا آخری مرحلہ تہذیب ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب نے جو قانون حیات کے مطابق روبہ زوال ہے' انسان کو جس

مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہاں زندگی، زندگی نہیں شرمندگی ہے۔ اپنی کتاب کے آخر میں سپنگلر لکھتے ہیں۔ "ہمارے لیے، جنہیں تقدیر نے اس تہذیب کے سپرد کر دیا ہے، ایک محدود اور تنگ سمت مقرر کی جاچکی ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رہی۔ ہمیں اپنی مرضی سے کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ بس اتنی آزادی ہے کہ کچھ کریں تو مجبوراً یا بالکل نہ کریں۔"

انہوں نے مزید لکھا کہ "ہماری صدی جدوجہد کرنے والی ریاستوں کی ایک صدی ہے، (صف آرا) فوجیں جنگ کے لیے ہیں، جنگ کا بدل نہیں..... ہندوستان، چین، جنوبی افریقہ، روس اور اسلام کا ظہور ہوگا۔ نئے حربے اور تیکنیک اور ان کے حریف اپنا اپنا رول ادا کریں گے۔ بار بار دہشت گردی اور خونی المیوں کے درمیان سے قوموں کے درمیان مصالحت اور زمین پر قیام امن کے لیے چیخیں بلند ہوتی رہیں گی۔" یہاں اس بات کا ذکر شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ سپنگلر ایک جمہوری معاشرے کو ناپسند کرتا ہے، ایسے ہی وہ آزاد صحافت کے بھی قائل نہیں، ان کی رائے میں جنگ عظمت کا سرچشمہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مفکر کی بجائے صاحب عمل یا "اہل جنون" کا۔ جو آتش نمرود میں کود جاتے ہیں۔ احترام کرتا ہے اور کہتا ہے "کہ اخلاق اور انصاف ہمیشہ طاقت اور نسل کے ہاتھوں ناکام ہوئے ہیں۔ عالمی تاریخ دراصل ایک عالمی عدالت ہے، جہاں سچائی اور انصاف نے طاقت اور نسل کے لیے قربانی دی ہے، اور جس نے ان انسانوں کے بارے میں موت کا فیصلہ سنایا ہے، جن کی نگاہ میں کام سے زیادہ سچائی اور طاقت سے زیادہ انصاف عزیز تھا۔"

سپنگلر کا کہنا ہے کہ عہد حاضر کی مغربی تہذیب کے زوال کو کوئی روک نہیں سکتا، اس لیے تہذیب کا یہ جنازہ پروقار طور پر اٹھنا چاہیے۔

سپنگلر کی کتاب پر J.G.Beus نے اپنی کتاب "مغربی تہذیب کو چیلنج" میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ سپنگلر کی اکثر پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں،

البتہ جو لوگ عیسائیت کی اخلاقی قدروں اور جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں' وہ شاید سپنگلر کے افکار کو ہضم نہ کر پائیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ سپنگلر نے یہ کتاب کتاب لکھ کر مغربی تہذیب کو جھنجھوڑا ہے کہ وہ از سرنو اپنی فکر اور سمت کا تعین کریں اور اس قانونی دائرے کو دیکھیں جو گردش کرتا ہوا موت کے نقطہ پر آن پہنچا ہے اور اب پھر سے انہی مقامات سے گزرے گا' جو تہذیب کی پیدائش' نشوونما اور موت سے تعلق رکھتے ہیں۔ زندہ قومیں اپنا احتساب کرتی رہتی ہیں اور اسی احتساب کی وجہ سے وہ انحطاط و زوال کی طاقتوں کے خلاف لڑ کر اپنا بچاؤ کرتی ہیں۔

سپنگلر کی کتاب پر ابھی بیس برس ہی گزرے تھے کہ ایک انگریز مورخ ٹاائن بی نے (Toynbee) سپنگلر کے نغمے کو دہرایا اور تہذیبوں کی حیات و موت میں کام کرنے والے عوامل کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ٹوان بی نے ان تمام تہذیبوں کی نشان دہی کی جن کا پتہ تاریخ نے دیا ہے اور جن میں سے سات تہذیبیں اب بھی بقید حیات ہیں۔ ٹوون بی کی تحقیق کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو اپنی فلاح و بہبود حتی کہ اپنی بقا کے لیے برابر چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان چیلنجوں کا جواب ہی اس معاشرے کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر وہ اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکتا' تو وہ اپنی قدروقیمت کھو بیٹھتا ہے اور بعض اوقات اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس چیلنج پر قابو پانے کے لیے نہ تو یہ ضروری ہے کہ اس معاشرے کا تعلق کسی برتر نسل سے ہو یا گردوپیش کے حالات سازگار ہوں' بلکہ نازک اور مشکل حالات میں اس چیلنج کا بہتر طور پر جواب دیا جا سکتا ہے' اور اس طریق سے معاشرہ اپنی معنوی زندگی کی نشوونما کرتا ہے اور ایک ایسی تخلیقی طاقت کو جنم دیتا ہے' جس کا دوسرا نام تہذیب ہے۔ ٹوائن بی کا کہنا ہے کہ لوگوں کی بھیڑ یا ہجوم کسی تہذیب کو جنم نہیں دیتی' یہ تو ایک تخلیقی فکر کی مالک اقلیت کے ہاتھوں جنم لیتی

ہے، جس کے نقطہ نظر کو عوام قبول کر کے رضا کارانہ طور پر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ ٹو این بی نے اسلام اور دور جدید میں اس کے کردار پر بھی لکھا ہے، حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے دہلی میں جواہرلال میموریل لیکچر بھی دیئے ہیں۔ جن سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ ٹو این بی کا قلم اپنی تنقیدی بصیرت، وسعت مطالعہ و تجربہ کے باوجود، اسلام کے بارے میں جانبداری کا ایک مبہم پہلو لیے ہوئے ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں اس کے بنیادی ماخذوں کا پورا علم نہیں رکھتے۔ القصہ تہذیبوں کی حیات و موت پر گبن، سپنگلر، ٹو این بی اور J.G.De.Beus نے جس بالغ نظری سے لکھا ہے، اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مغربی قومیں اپنی اس تخلیقی فکر کے سوتوں کو خشک نہ ہونے دیں جو ایک تہذیب کو جنم دیتی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ مغرب روبہ زوال ہے اور مشرق اس کی سیاسی قلمرو سے باہر نکل گیا ہے، لیکن اس پر تسلط قائم رکھنے کی یہی ایک صورت ہے کہ مغرب کی تخلیقی فکر اور اس کی سیادت کو کوئی چیلنج نہ کرے۔

اس داستاں سرائی سے بنیادی مقصد یہ ہے کہ جس بصیرت، محنت اور لگن سے مغربی مفکرین نے انحطاط و زوال کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی بے رحمی سے اپنی تہذیب و تمدن کا تجزیہ کیا ہے، اس سے اہل علم نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ لیکن عہد حاضر میں جو داخلی اور خارجی عوامل ملت اسلامیہ کی شکست و ریخت کا موجب بنے ہیں، اس پر کوئی مربوط اور ٹھوس تحریر نہیں آئی۔ جس کی وجہ سے نوجوان نسل میں ایک شدید قلق اور اضطراب پایا جاتا ہے، اور مغرب کے ہاتھوں مختلف محاذوں پر پے بہ پے شکست کھانے کے بعد خیال تھا کہ مسلم دنیا خواب غفلت سے بیدار ہو جائے گی، لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا۔ عرب دنیا نے اس صدی کی دو خوف ناک جنگوں میں مغرب کا ساتھ دیا، لیکن دونو بار مغرب ہی کے ہاتھوں عرب تاریخ خون اور

آنسوؤں سے لکھی گئی۔ پہلی جنگ عظیم میں عرب رہنماؤں نے اپنی نادانی سے مغرب کا ساتھ دیا، لیکن جنگ کے خاتمے پر عرب سرزمین کو جو صدیوں سے زبان، مذہب، جغرافیہ اور روایات کے ان ٹوٹ رشتوں میں منسلک تھی، کئی ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا اور دوسری جنگ عالمگیر کے بعد مغرب نے فلسطین کے ایک بڑے حصے کو یہودیوں کے حوالے کر دیا اور آج پوری عرب دنیا اسرائیل کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہے۔ یہ المیہ پاکستان میں بھی دہرایا گیا۔ پاکستان کی سیاسی قیادت نے اپنے عوام اور اس کی تاریخ سے تغافل برتتے ہوئے معاہدہ بغداد جیسے مغربی معاہدوں میں شامل ہو کر ایک دنیا کی دشمنی مول لی، لیکن بندگی میں پھر بھی بھلا نہ ہوا۔ یعنی مغرب نے پاکستانی تاریخ کی کسی بھی فیصلہ کن گھڑی میں پاکستان کا ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے اگر آج مسلم دنیا میں نوجوان احساس محرومی کے ہاتھوں انتہا پسندی کی راہ پر آ رہے ہیں، تو اس کی ذمہ داری بنیادی طور پر ہماری اجتماعی قیادت کی نااہلی، بے روزگاری، سماجی زندگی کی ناہمواری، نظام تعلیم کی شکستگی اور مغرب کی سیاسی چالوں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اہل علم سے ہماری درخواست ہے کہ وہ زندگی کے تلخ حقائق اور تہذیبوں کی حیات و موت میں کام کرنے والے عوامل کا سامنا کریں اور پاکستانی کلچر، تہذیب اور ہماری صحت مند اخلاقی اور عملی روایات کے زوال پر قلم اٹھائیں اور ان اسباب کا سراغ لگائیں جنھوں نے ہمارے ”جوہر دراک“ اور ”نشتر تحقیق“ کو کند کر دیا ہے اور یہ بھی دیکھیں اقبال و جناح نے اپنی تحریروں میں رجعت پسند طاقتوں کو ناکام بنانے کے لیے جو کچھ لکھا ہے، کیا ان سے ہمیں نجات مل گئی؟ اگر نہیں ملی تو اس کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ہم نے وقت کے چیلنج کا جواب دیا؟ بے شبہ اپنی فکری اور عملی زندگی کا احتساب کئے بغیر ہم انحطاط و زوال کی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا ہم اس مقابلہ کے لیے تیار ہیں؟ موجودہ وقت میں اسلام آباد میں ”قومی کمیشن برائے تاریخ و ثقافت“ ایک نئے